دشتِ تنہائی

فاخرہ بتول



دشتِ تنہائی

انتخاب

فاخرہ بتول



فیض احمد فیض کے نام

......

ہمارے دل کے اندر کوئی شب بھر بین کرتا ہے
کبھی تم پوچھ لو
جو اِس پہ بیتی، جو ستم ٹوٹا
ہمارے دل کے اندر کوئی شب بھر بین کرتا ہے

فہرست

فاخرہ بتول کی ''دشتِ تنہائی.......''

فاخرہ بتول نے پہلی بار ''دشتِ تنہائی'' کا انتخاب کی تو وہ شاید جلدی میں تھی۔ حالانکہ اکثر وہ ''جلدی'' میں نہیں ہوتی' بہت سوچ سمجھ کر' انتہائی ذہین طریقے سے فیصلے کرتی ہے۔

یہی اس کی خوبی ہے!

مَیں اپنے حوالے سے بے باک ہوں' Rude ہوں یا بدتمیز وغیرہ وغیرہ.......یہ ''خوبیاں'' کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ خوبی تو یہ ہے کہ فاخرہ بتول' بلاشبہ اس ملک (بیرون ملک جو اُردو جانتے ہیں) کی مقبول اور سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ میرے اس دعوے سے اگر کسی کو تکلیف پہنچے تو میں معذرت خواہ نہیں' مگر یہ سچ ہے کہ وہ بڑی شاعرہ ہے اور اس لیے بھی بڑی ہے کہ خود لکھتی ہے وگرنہ

ہم مردوں کے لیے کسی شاعرہ پر ''لکھوانے'' کا الزام لگانے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔

وہ ایک شاعر کی حیثیت سے، ہمارے دور کی، ہماری جنریشن کی (جس میں، مَیں خود شامل ہوں) سب سے بڑی شاعرہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ چند خاص لوگ جو'' فیصلے'' کرتے ہیں، مجھے جانتے ہیں کہ میں قلم کاغذ کے حوالے سے نسلی اور اصلی ''امین'' ہوں اور لکھتے ہوئے بعض اوقات بھول جاتا ہوں کہ یہ تو میرے محترم تھے!......آپ میرے انتہائی محترم عطاء الحق قاسمی، میرے مُربی حسن نثار، میرے شاہ جی عباس اطہر اور میرے ''مٹھے بابے'' منو بھائی سے پوچھ لیجئے۔

مَیں لکھتے ہوئے'' 2 نمبری'' نہیں کرسکتا!

فاخرہ بتول کی یہ منتخب کردہ ''دشتِ تنہائی......'' ان تمام ''انتخابات'' سے معتبر اور مؤقر ہے جو درجنوں کے حساب سے مارکیٹ میں پڑے ہیں۔

آپ فاخرہ بتول کا انتخاب پڑھیے اور مجھے اجازت......

تنویر عباس نقوی

اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی

پتھر

ریت سے بت نہ بنا، اے میرے اچھے فنکار
ایک لمحے کو ٹھہر، میں تجھے پتھر لادوں!
میں ترے سامنے انبار لگادوں لیکن
کون سے رنگ کا پتھر ترے کام آئے گا
سُرخ پتھر جسے دل کہتی ہے بے دل دنیا
یا وہ پتھرائی ہوئی آنکھ کا نیلا پتھر
جس میں صدیوں کے تحیر کے پڑے ہوں ڈورے
کیا تجھے روح کے پتھر کی ضرورت ہوگی
جس پہ حق بات بھی پتھر کی طرح گرتی ہے
اِک وہ پتھر ہے جسے کہتے ہیں تہذیبِ سفید
اس کے مرمر میں سیہ خون جھلک جاتا ہے
ایک انصاف کا پتھر بھی تو ہوتا ہے مگر
ہاتھ میں تیشۂ زر ہو تو وہ ہاتھ آتا ہے
جتنے معیار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
جتنے افکار ہیں اس دور کے سب پتھر ہیں
شعر بھی رقص بھی، تصویر وغنا بھی پتھر
میرا الہام، ترا ذہن رسا بھی پتھر
اس زمانے میں تو ہر فن کا نشاں پتھر ہے
ہاتھ پتھر ہیں ترے، میری زباں پتھر ہے
ریت سے بت نہ بنا، اے میرے اچھے فنکار

ابن انشاء

لوگ پوچھیں گے

لوگ پوچھیں گے کیوں اُداس ہو تم؟
اور جو دل میں آئے سو کہیو!
یونہی ماحول کی گرانی ہے
دن خزاں کے ذرا اُداس سے ہیں
کتنے بوجھل ہیں شام کے سائے
ان کی بابت خموش ہی رہیو
نام ان کا نہ درمیاں آئے
نام ان کا نہ درمیاں آئے
کتنے بوجھل ہیں شام کے سائے
دن خزاں کے ذرا اُداس سے ہیں
یونہی ماحول کی گرانی ہے
اور جو دل میں آئے سو کہیو!
لوگ پوچھیں گے کیوں اُداس ہو تم؟

فتخار عارف

شہرِ علم کے دروازے پر

کبھی کبھی دل یہ سوچتا ہے
نہ جانے ہم بے یقین لوگوں کو نام حیدرؑ سے ربط کیوں ہے
حکیم جانے وہ کیسی حکمت سے آشنا تھا
شجیع جانے کہ بدر و خیبر کی فتح مندی کی راز کیا تھا
علیم جانے وہ علم کے کون سے سفینوں کا نا خدا تھا
مجھے تو بس صرف یہ خبر ہے
وہ میرے مولا کی خوشبوؤں میں رچا بسا تھا
وہ ان کے دامانِ عاطفت میں پلا بڑھا تھا
اور اس کے دن رات میرے آقا کے چشم و ابرو و جنبشِ لب کے منتظر تھے
وہ رات کو دشمنوں کے نرغے میں سو رہا تھا تو ان کی خاطر
جدال میں سر سے پاؤں تک سُرخ ہو رہا تھا تو ان کی خاطر
سو اس کو محبوب جانتا ہوں
سو اس کو مقصود مانتا ہوں
سعادتیں اس کے نام سے ہیں
محبتوں کے سبھی گھرانوں کی نسبتیں اس کے نام سے ہیں

افتخار عارف

کوچ

جس روز ہمارا کوچ ہوگا
پھولوں کی دُکانیں بند ہوں گی
شیریں سخنوں کے حرفِ دُشنام
بے مہر زبانیں بند ہوں گی

پلکوں پہ نمی کا ذکر ہی کیا
یادوں کا سراغ تک نہ ہوگا
ہمواریِٔ ہر نفس سلامت
دل پر کوئی داغ تک نہ ہوگا

پامالیِ خواب کی کہانی
کہنے کو چراغ تک نہ ہوگا
معبود! اس آخری سفر میں
تنہائی کو سرخرو ہی رکھنا

جز تیرے کوئی نہیں نگہدار
اس دن بھی خیال تو ہی رکھنا
جس آنکھ نے عمر بھر رلایا
اس آنکھ کو بے وضو ہی رکھنا

امجد اسلام امجد

ایک لڑکی

گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
وہ جب بھی کالج کی سیڑیئوں سے
سہیلیوں کو لیے اُترتی
تو ایسے لگتا کہ جیسے دل میں اُتر رہی ہو
کچھ اس تیقن سے بات کرتی
کہ جیسے دنیا اسی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے
وہ اپنے رستے پہ دل بچھاتی ہوئی نگاہوں سے ہنس کے کہتی
تمہارے جیسے بہت سے لڑکوں سے میں یہ باتیں
بہت سے برسوں سے سُن رہی ہوں
میں ساحلوں کی ہوا ہوں نیلے سمندروں کے لیے بنی ہوں
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
جو راہ چلتی تو ایسا لگتا کہ جیسے دل میں اُتر رہی ہو
وہ کل ملی تو اسی طرح تھی
گلاب چہرے پہ مسکراہٹ، چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
کہ جیسے چاندی پگھل رہی ہو
مگر جو وہ بولی تو اس کے لہجے میں وہ تھکن تھی
کہ جیسے صدیوں سے دشتِ ظلمت میں چل رہی ہو

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

اس کے لیے پہلی نظم

وہ اِک نازک سی مورت
لاڈلی سی، لا اُبالی سی
بہت سادہ مگر دلکش، بناوٹ اوڑھ کر اِک غیر ارادی
بھولپن سے بند کلیوں کی طرح جب مسکراتی ہے
تو پت جھڑ میں بہاروں کا زمانہ لوٹ آتا ہے

میں اپنی شاعری میں مختلف رنگوں کے لفظوں سے
جو تصویریں بناتا ہوں
اسی کے عکس ہوتے ہیں
جو تتلی کی طرح کاغذ پہ محوِ رقص ہوتے ہیں
وہ چلتی ہے تو موجوں کی روانی ساتھ چلتی ہے
حقیقت دائیں بائیں اور کہانی ساتھ چلتی ہے
کبھی جب بھول کر کمرے کے آگے سے گزرتی ہے
تو یوں جیسے حسیں لمحے گزرتے ہیں
مگر طرفہ تماشا ہے
اسے پڑھنا تو آساں ہے مگر پڑھ کر سمجھنا قدرے مشکل ہے
یہ وہ رستہ ہے جس کے سامنے دریا ہے

اور دریا کے پرلے پار منزل ہے
اسے مفہوم سے عاری ادائیں زیب دیتی ہیں
کہ اس کی تربیت میں کاتبِ تقدیر نے
اِک مشرقی آداب کا پیکر تراشا ہے
جبھی تو وہ تصور میں حسیں سپنے نہیں بنتی
صدائیں دے رہے ہوتے ہیں پہلو میں کئی جذبے نہیں سنتی
جوانی میں بھی اپنے آپ سے باہر نہیں ہوتی
کہ جیسے دن میں جگنو کی چمک ظاہر نہیں ہوتی
اسے جس زاویے سے بھی پرکھ کر دیکھتا ہوں میں
وہ ہر معیار پر پوری اُترتی ہے
تقدس کے ترازو میں اسے چپکے سے رکھ کر تولتا ہوں میں
تو خوشبو مانگ بھرتی ہے
ہیولے کی طرح منظر میں پس منظر کی اک تصویر اُبھرتی ہے
جسے میں چھو نہیں سکتا
فقط محسوس کرتا ہوں

اسلم انصاری

محبت کے دنوں کی یاد میں ایک نظم

بہت مدت ہوئی

جب میری آنکھیں خواب بنتی تھیں
وہ اِک ہجراں زدہ عہدِ بہاراں تھا
مجھے پھولوں بھری راہیں بلاتی تھیں
مگر میں ایک نوکِ خار کی گہری چبھن کو
حاصلِ ہستی سمجھتا تھا!
تمہیں نا مہرباں کہتے نہ تھکتا تھا
بہت دن تک تمہیں بے مہریٔ ایّام کا پیکر سمجھتا تھا
میں اس شائستہ اندازِ تکلم کو
صریحاً سنگدل، مغرور لہجہ ہی سمجھتا تھا
تمہاری تمکنت میں عجز کی جو رمز تھی
اس کو نہ سمجھا تھا!
ہواؤں سے اُلجھتا، موسموں کی دین سے انکار کرتا
میں تمہیں الزام دیتا تھا
وہ سب اشجار جن کی مہرباں چھاؤں
مجھے کیکٹس سے بدتر تھے!
وہ ساری دلکشا راہیں، جو منزل کا اشارہ تھیں
مجھے اُلجھی ہوئی پگڈنڈیوں کا جال لگتی تھیں
(مگر میں اب یہ کہتا ہوں).......
نہیں، تم مہرباں ہی تھیں
تم اپنی روح کی گہرائیوں میں اب بھی ویسی خوبصورت ہو
تمہارے دلنشیں لہجے میں جو آواز گاتی ہے
کسی بے مہر کے ہونٹوں پہ کیسے ناچ سکتی ہے؟
نہیں......تم مہرباں ہی تھیں!

اصغر ندیم سید

ابھی کچھ دن لگیں گے

ابھی کچھ دن لگیں گے
خواب کو تعبیر ہونے میں
سفر کو منزلوں کی حد پہ لانے میں
پرندے کو ہوا کے رُخ پہ آنے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے
دھوپ کو کھلیان کے ریشوں میں اپنا بیج بونے میں
شجر کو آنے والے موسموں کے نام اِک درخواست لکھنے میں
کسی عاشق کو اپنے دل کی کٹیا صاف کرنے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے
تتلیوں کو پھول سے مانوس ہونے میں
سخن کو درد کی تصویر بننے میں
صدا کو شہرِ جاں گونج بننے میں
صبا کو باغ سے خوشبو چرانے میں

ابھی کچھ دن لگیں گے
رقص کو آزاد ہونے میں

کسی کی بات کا مطلب سمجھنے میں
کسی کو نیند میں اپنے لیے اِک خواب کا پودا لگانے میں
کسی کے پاس آنے میں
کسی سے دور جانے میں
ابھی کچھ دن لگیں گے

احمد شمیم

کبھی ہم بھی خوبصورت تھے

کتابوں میں بسی خوشبو کی صورت
سانس ساکن تھی!
بہت سے اَن کہے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے
پرندوں کے پروں پر نظم لکھ کر
دُور کی جھیلوں میں بسنے والے لوگوں کو سناتے تھے
جو ہم سے دُور تھے
لیکن ہمارے پاس رہتے تھے!
نئے دن کی مسافت

جب کرن کے ساتھ آنگن میں اُترتی تھی
تو ہم کہتے تھے.......امی
تتلیوں کے پَر بہت ہی خوبصورت ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں رنگوں کے جگنو روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
نئے دن کی مسافت رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ
کھڑکی سے بلاتی ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

ارشد ملک

مجھے اک نظم لکھنی ہے

اُسے کہنا!
کسی بھی خوبصورت شام میں ملنے چلا آئے
مجھے اک نظم لکھنی ہے
سنہری دھوپ کے جیسا ترا رنگ روپ اجلا سا

دھلے بارش سے دیکھو تو حسیں پیارے نظارے ہیں
فلک کے استعارے ہیں
یہ تیری آنکھ جیسے ہیں
سو ان سب پر
مجھے اک نظم لکھنی ہے
اُسے کہنا مری کی جھومتی چنچل ہواؤں سی
تری اِن شوخ زُلفوں پر
مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
نشیلی آنکھ میں تیری شرابوں کی سی مستی ہے
تری ان نرم پلکوں پر یہ جتنے بھی ستارے ہیں
مجھے ان سب کو چھونا ہے
ترے ان بند ہونٹوں میں چھپی جو مسکراہٹ ہے
یہی تو شاعری ہے بس
مجھے اک نظم لکھنی ہے
اُسے کہنا!
تری آنکھیں بہت کچھ بولتی ہیں
تری باتیں شہد سا گھولتی ہیں
یہ پھولوں پر گری شبنم ترے گالوں کے جیسی ہے!
چمکتی چاندنی جیسی تری روشن جبیں پر بھی
مجھے اک نظم لکھنی ہے
گھنی شاخوں کے پتوں میں چھپا وہ چاند پیارا سا
ترے چہرے کے جیسا ہے
ترے اس چاند چہرے پر مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
اُسے کہنا مجھے اک نظم لکھنی ہے
کسی بھی خوبصورت شام میں ملنے چلا آئے

اعزاز احمد آزاد

چلو کہ جشنِ بہار دیکھیں

چلو کہ جشنِ بہار دیکھیں
چلو کہ پھولوں کے ساتھ کھیلیں
چلو کہ خیام کی رباعی کا کوئی مصرعہ ہی گنگنائیں
چلو کہ شعروں کی کھیتیوں میں
غزل اُگائیں
کہ اس زمیں پر
بجز محبت
کوئی بھی جذبہ امر نہیں ہے
مگر کسی کو خبر نہیں ہے

اکرام جمالی

واہمہ

اسی سوچ میں تھا
کہ تم بھول بیٹھے ہو
یا میرے گاؤں کا چٹھی رساں مر گیا ہے!

یکا یک کھٹا کھٹ کی آواز نے
میری سوچوں کے دھارے کو موڑا
جو میری ہی جھگی کے در کے شکستہ کواڑوں سے
اُٹھ اُٹھ کے دہشت سی پھیلا رہی تھی!

یونہی بے دلی سے میں اُٹھا
کہ دیکھوں تو اس چلچلاتی ہوئی دو پہر میں
مری مفلسی کا تمسخر اُڑانے کو کوئی قرض خواہ آ رہا ہے!
ارے تم؟
ارے کیا یہ سب کچھ مرا واہمہ تھا؟
خدا میرے گاؤں کے چٹھی رساں کو
سدا زندہ و شاد آباد رکھے
کہ تم تو بہ نفس نفیس آ رہے ہو!

احمد فواد

نظم

اس کتاب میں جگہ جگہ گرد کے پاؤں کے نشانات ہیں
سسکیوں نے اس کا منہ نوچا ہے
چیخوں نے اس کے گھر پر قبضہ کیا
یہ کتاب تھکن نے نہیں لکھی
پیڑوں نے مُٹھی بھر سایہ دیا
سمندر نے دریا بھر روشنائی دی
ستاروں نے پیالہ بھر ٹھنڈک دی
سورج نے ذرّہ بھر آگ دی
مٹی نے دامن بھر درد دیا
تتلیوں نے چندہ کر کے کچھ رنگ دیا
دن نے اپنے ہاتھ کی لکیریں دیں
رات نے کٹورہ بھر بے خوابی دی
پاگل پن نے اپنی تمام جمع پونجی لگا کر اسے شائع کر دیا
اس کے پورے بدن پر نیل پڑے ہوئے ہیں
دیکھو اسے ذرا احتیاط سے پڑھنا

آلِ عمران

ہوں بس تمہارا

ہزار ہا بار مجھ سے پوچھے گئے سوالوں کو
پھر سے لے کر تم آ گئے ہو
میں تم کو کھونے کے خوف میں ہوں
کہ میرے چاروں طرف صدائیں
پکارتی ہیں
اگرچہ ایسا مزاج میرا نہیں ہے جاناں!
مگر میں جب بھی کہیں گیا ہوں
پلٹ کے آیا تمہاری جانب
میں چاہتا ہوں
جو تم کو بھولوں......بھٹک میں جاؤں
مزاج میرا عجیب سا ہے
تمہاری سوچوں میں گم رہا ہوں
ہزار ہا بار تم نے پوچھا
ہزار ہا بار چپ ہی چپ میں پکارتا ہوں
سنو میں کب سے یہ کہہ رہا ہوں
میں جو ہوں، جیسا، جہاں کہیں ہوں
ہوں بس تمہارا

ہزار ہا بار مجھ سے پوچھے گئے سوالوں کو
پھر سے لے کر تم آ گئے ہو
کہوں میں کیا اب
زبان چپ ہے
جواب گم ہے
مگر خموشی یہ کہہ رہی ہے
سنو میں جیسا' جہاں کہیں ہوں
ہوں بس تمہارا

پروین شاکر

زود پشیماں

گہری بھوری آنکھوں والا اِک شہزادہ
دور دیس سے
چمکیلے' مشکی گھوڑے پر ہوا سے باتیں کرتا
جگر جگر کرتی تلوار سے جنگل کاٹتا آیا
دروازوں سے لپٹی بیلیں پرے ہٹاتا
جنگل کی بانہوں میں جکڑے محل کے ہاتھ چھڑاتا

جب اندر آیا تو دیکھا
شہزادی کے جسم کی ساری سوئیاں زنگ آلودہ تھیں
رستہ دیکھنے والی آنکھیں
سارے شکوے بھلا چکی تھیں

پروین شاکر

ساتھ

کتنی دیر تک
املتاس کے پیڑ کے نیچے
بیٹھ کے ہم نے باتیں کیں
کچھ یاد نہیں
بس اتنا اندازہ ہے
چاند ہماری پشت سے ہو کر
آنکھوں تک پہنچا تھا

تنویر عباس نقوی

The Day of Judgment?

مَیں راہ چلتے میں یوں ہی اکثر
حسین چہروں کو کھوجتا ہوں!
یوں دیکھنے میں تمام چہرے' گلاب چہرے
ہوں ایک دوجے سے مختلف خواہ'
.......جو سوچیے تو تمام چہرے' عذاب چہرے
ہیں دیکھنے میں بہت ہی سادہ؟
قُمار بازی' منافقت کی پٹاریوں میں
یہ کُنڈلی مارے پھنکارتے ہیں
جو دیکھیئے تو' گلاب چہرے!
جو سوچیئے تو' عذاب چہرے!
غزال صورت' فریب خوردہ!!
یہ غور کیجئے!
کہ خوبصورت سے چہروں والی جو لڑکیاں ہیں' در اصل کیا ہیں؟
لُٹا کے عصمت'
دَبی دَبی سی' ہنسی کے موتی بکھیرتی ہیں'
جھکی جھکی سی' ستم گروں کے کباڑ خانوں میں آ گئی ہیں

نیلام گھر میں یہ بک رہی ہیں،
قلیل رقمیں، شکیل چہروں پہ لگ رہی ہیں،
ہوس کے آنگنوں میں سیم تن پہ تھرک رہے ہیں

یہ گال اِن کے، یہ خال اِن کے
گواہ بن کر
یہ تختِ طاؤس کے مقابل
اُن حکمرانوں کی روسیاہی دکھا رہی ہیں
وہ جن کا انصاف
بے بسوں کے، لیے تھا، ان کے، لیے نہیں تھا
خدا گواہ ہے!
سپاٹ آنکھیں، اُداس چہرے؟
ستم گروں کے اسیر رہ کر
یہ خاک میں خاک ہوگئی ہیں!
یہ چیختے ہیں، پُکارتے ہیں!؟؟؟
دُہائی دیتے یہ کہہ رہے ہیں
.......کہ ہم پہ اب بھی ستم ہی ڈھاؤ
کہ ہم پہ اگلے جہاں میں
جو ہو چکا ہے، وہی ہے ہونا ؟؟؟

تنویر عباس نقوی

Installment

ابھی تو ہم نے شمار کرنا تھا
رفعتوں کو، محبتوں کو، امانتوں کو
وہ رفعتیں، جن کو ہم نے جاناں!
دورانِ اُلفت چھوا ہے اکثر
محبتیں وہ کہ، جن کا ہم نے
لہو بہایا ہے رتجگوں میں
امانتیں وہ
جو چھوڑ آیا، مَیں تیرے دَر پہ
جہاں پہ اکثر مُراد میری ہوئی تھی پوری
مگر
وہ حالات، اب نہیں ہیں
محبتوں میں،
کسی تمنا کو سرفرازی نہ دے سکوں گا
تو رَفعتوں کو، محبتوں کو، امانوں کو سنبھال رکھنا
کہ، میری آنکھیں، یہ میرے بازو، مرے دل و جاں
لہولہو میں

تنویر عباس نقوی

جرمِ بصارت

مَیں ہوں چندر گپت کا چیلا
یا ہوں
جین کے مت کا رسیا؟
میرے حصّے میں یہ آخر
جگت جگت کے فاقے کیوں ہیں؟
کیا کسی بھی مَت کا پیرو
اکثر بھوکا مرتا ہے؟؟؟

تنویر عباس نقوی

Prophesy!

ایک چمن تھا!
اُجڑ گیا ہے
اُلٹی گنگا بہہ نکلی ہے؟!!
چھوٹ ملی ہے صیّادوں کو
قید کیا ہے سب ہرنوں کو

آج سمے کی حالت یہ ہے
چمگادڑ بھی روشن دن کے سارے منظر دیکھ رہے ہیں
سورج آنکھوں سے بھی اَب تو
غائب ہوئے ہیں سارے منظر

ایک چمن تھا!
اُجڑ گیا ہے،
چنڈو خانے روشن ہیں اور
بکھر رہی ہیں سوچیں ہر سو
سب افکار ہیں، مکڑی کے جالے کی صُورت
ہرسو دَرد کے لشکر پھیلے
لیکن دَرماں کوئی نہیں ہے
خوشیاں سب نابود ہوئی ہیں

غم کا پُرساں کوئی نہیں ہے

ہم میں تو فرہاد کے تن کی
قوت ہے، نہ ہمت شاید
نہ ہی قیسِ غمّی کی صورت پتھر کھانے کی جرأت ہے!

ابن مریم کوئی تو ہوگا؟
کوئی تو ہوگا موسیٰ جیسا؟
کوئی حسینؑ کا پیرو ہو

یا
خود کو پھر سقراط بنالے
کوئی تو حق کے منصب پر اب
لگتا ہے، سَر پیش کرے گا!!!

تنویر عباس نقوی

Lost Of Love?

مجھے گر فون اُٹھانے میں
ذرا سی دیر ہو جائے
تو تم ناراض ہوتی ہو!
کبھی اپنے متعلق بھی
تو سوچو جانِ جاناں تم
میرے ہر کام میں تم نے بھی کتنی دیر کر دی ہے

مجھے گر فون اُٹھانے میں
ذرا سی دیر ہو جائے
بہت ناراض ہوتی ہو!
مگر' یہ بات بھی تم کو بتاؤں میں
تمہاری بے رُخی میں بھی محبت ہے
مجھے معلوم ہے' تم کو بہت مجھ سے محبت ہے
تمہیں مجھ سے محبت ہے
فقط مجھ سے محبت ہے

تنویر عباس نقوی

کٹھن مایا

اس دُنیا کی گھمن گھیری کے چکر میں
اُلجھا، اُلجھا!!
کوئی تو ایسا بھی ہو جو کہ
''اوکھے ویلے'' کام آ جائے!
چاروں اَور قضا ہے رقصاں
خوشی کی نوبت باجے دَھم دَھم
چار دنوں کی خاطر مَیں نے
غم کے دھاروں میں یوں بہہ کر
اپنا آپ بچایا ہے
لیکن میرے دل کے اندر
جانے کون سمایا ہے؟

جس نے ہر پل میرا جیون
کانٹوں سے اُلجھایا ہے
دریاؤں کی بالو ریت،
میدانوں کی سوکھی مٹی
بھوک سے مرتے آدم زادے
پیاسے پھرتے بندے، کوّے
چیلیں ''ماس'' کو ترستی ہیں!

میری نظر میں سب ہیں، لوگو!
مَیں نے بہت قریب سے اِن کا
ہر پَل، ہر دُکھ دیکھا ہے!
میری سوچ اُفق پہ اِن کا
گہرا کالا سایہ ہے!
لیکن میرے دل کے اندر
جانے کون سمایا ہے؟

تنویر عباس نقوی

Universal Truth

جیون کے اُن سب برسوں میں
جو کہ
تم بن بیت چکے ہیں!
کیا کھویا اور کیا پایا ہے؟
جب یہ سوچوں جانِ جاناں!
تو احساس یہ ہوتا ہے
تم کو پا کر

میں نے گویا

ساری دُنیا پالی پل میں

جیون کے اُن سب برسوں میں

جو کہ

تم بن بیت چکے ہیں!

اُن میں سانسیں بار تھیں مجھ پر

اُن میں ''عشق خزینہ'' کب تھا؟

اُن میں جینا؟

جینا کب تھا!!!

ڈاکٹر تحسین فراقی

ایک مختصر نظم

گلاب چہرے چھتوں پہ کل بھی کھلے ہوئے تھے

گلاب چہرے چھتوں پہ کھلتے ہیں روز اب بھی

مگر وہ چہرہ اُداس چہرہ

کہیں خلاؤں میں کھو گیا ہے

زمین کا رزق ہو گیا ہے

جون ایلیا

تم مجھے بتاؤ تو

تم نے مجھ کو لکھا ہے، میرے خط جلا دیجئے
مجھ کو فکر رہتی ہے آپ انہیں گنوا دیجئے
آپ کا کوئی ساتھی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا
دیکھیے میں کہتی ہوں یہ بہت بُرا ہو گا

O

میں بھی کچھ کہوں تم سے اے میری فروزینہ
رشک سرو سیمینا
اے بہ ناز کی مینا
اے بہ جلوہ آئینہ
میں سمہارے ہر خط کو لوحِ دل سمجھتا ہوں
لوحِ دل جلا دوں کیا؟
سطر سطر ہے ان کی، کہکشاں خیالوں کی
کہکشاں لُٹا دوں کیا؟
جو بھی حرف ہے ان کا، نقش جانِ شیریں ہے
نقشِ جاں مٹا دوں کیا؟
ان کا جو بھی نقطہ ہے، ہے سوادِ بینائی

میں انہیں گنوا دوں کیا؟
لوحِ دل جلا دوں کیا
کہکشاں لُٹا دوں کیا
نقشِ جاں مٹا دوں کیا

O

مجھ کو ایسے خط لکھ کر اپنی سوچ میں شاید
جرم کر گئی ہو تم
اور خیال آنے پر اس سے ڈر گئی ہو تم
جرم کے تصور میں گر یہ خط لکھے تم نے
پھر تو میری رائے میں جرم ہی کیے تم نے
اے مری فروزینہ
دل کی جانِ زرّینا!
رَنگ رَنگ رنگینا!
بات جو ہے وہ کیا ہے
تم مجھے بتاؤ تو.......
میں تمہیں نہیں سمجھا
تم سمجھ میں آؤ تو
جرم کیوں کیے تم نے؟
خط ہی کیوں لکھے تم نے؟

حبیب جالب

مشاعرہ

ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
یہی وہ کار تھی جس میں وہ لوگ آئے تھے
حضور آپ ہی جالب ہیں آپ کی خاطر
تمام شہر میں دیوانہ وار گھومے ہیں
کسی طرح سے کہیں آپ کا سراغ ملے
حضور ہم نے بگولوں کے پاؤں چومے ہیں
ابھی جو پاس سے گزری ہے خاک اُڑاتی ہوئی
مشاعرے میں اسی کار سے گیا تھا میں

خالد شریف

بچھڑنے سے ذرا پہلے

بچھڑنے سے ذرا پہلے
تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا

تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا
کہ یوں چاہت کو ٹھکرایا نہیں کرتے
کہ یوں بیتے دنوں کو بھولنا اچھا نہیں ہوتا
کہ یوں انجان بن کر چین سے جینا ہمارے واسطے
ممکن نہیں ہوگا
تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا
کہ وہ باتیں جو ہم اِک دوسرے سے کر چکے ہیں
اب کبھی واپس نہ آئیں گی
کہ وہ لمحے جو ہم اِک دوسرے میں جی چکے ہیں
پھر کبھی زندہ نہیں ہو گے
بچھڑنے سے ذرا پہلے
تمہیں بھی سوچ لینا چاہیے تھا

خالد شریف

کزن

آج احساس ہوا ہے مجھ کو
تم نے سر پاؤں پہ رکھ کر میرے

بھیک مانگی تھی رفاقت کی جب
میں نے کچھ بننے کی دھن میں اس وقت
اور کوئی حور کوئی اپسرا پانے کے لیے
یا کسی اپنے سے مضبوط گھرانے کے لیے
تم کو تڑپایا تھا، ٹھکرایا تھا
آخری اپنی ملاقات تھی وہ
حور تو مل گئی مجھ کو لیکن
اس نے قدموں پہ کئی بار جھکایا مجھ کو
ایسے لمحوں میں خدا جانتا ہے
تم کئی بار مجھے ٹوٹ کے یاد آئی ہو

رشید جاوید

خواب لے لو

بازار میں
اِک شخص
صدا لگا رہا تھا
''خواب لے لو

خواب لے لو"

اور لوگ تھے

کہ دھڑا دھڑ

اس سے خواب خرید رہے تھے

ایک آدمی نے کہا

"ابھی تو

پچھلے برس کے خواب پورے نہیں ہوئے"

تو

خواب فروش نے جواب دیا

کہ

"میں نے صرف خواب بیچے تھے

تعبیریں نہیں"

ذاھد عظیم ذاھد

وعدے

سُرخ گلابوں والا موسم

اور تعارف کچھ جذبوں کا
پہلے پہلے پیار کے جذبے
پیار کی پہلی پہلی باتیں
ملن کی راتیں
اور جدا ہونے کی دھمکی
(پھر دھمکی کے بعد کا ملنا)
بعد کے جذبے بعد کے وعدے
(سارے وعدے جھوٹے ثابت ہو جائیں تو؟''
لیکن سارے وعدے جھوٹ ثابت ہو کر
اور حسیں لگنے لگتے ہیں
اور ملن کے ایسے ایسے لمحے پیدا کر دیتے ہیں
جن سے پیار کے ٹوٹے بندھن
جڑ جاتے ہیں
جھوٹے وعدے پر جب رُوٹھیں
رُوٹھ کے مانیں
پیار زیادہ ہو جاتا ہے
سارے وعدے سچے ہوتے اور وفا ہو جایا کرتے
اس دنیا سے پہلے بہت پہلے پیار مر جاتا

سلیم کوثر

سندیسہ

اسے کہنا
کبھی ملنے چلا آئے
ہمارے پاؤں میں جو راستہ تھا
راستے میں پیڑ تھے
پیڑوں پہ جتنی طائروں کی ٹولیاں
ہم سے ملا کرتی تھیں
اب وہ اُڑتے اُڑتے تھک گئی ہیں
وہ گھنی شاخیں جو ہم پر سایہ کرتی تھیں
وہ سب مُرجھا گئی ہیں
تم اسے کہنا
کبھی ملنے چلا آئے
لبوں پر لفظ ہیں
لفظوں میں کوئی داستاں' قصہ کہانی
جو اسے اکثر سناتے تھے
کسے جا کر سنائیں گے
بتائیں گے
کہ ہم محرابِ اَبرو میں ستارے ٹانکنے والے
درِلب' بوسۂ اظہار کی دستک سے اکثر کھولنے والے
کبھی بکھری زُلفوں میں ہم
مہتاب کے گجرے بنا کر باندھنے والے

چراغ اور آئینے کے درمیاں
کب سے سرِ ساحل کھڑے موجوں کو تکتے ہیں
اسے کہنا
اسے ہم یاد کرتے ہیں
اسے کہنا
ہم آ کر خود اُسے ملتے
مگر مقتل بدلتے موسموں کے خون میں رنگین ہے
اور ہم
قطار اندر قطار ایسے بہت سے موسموں کے درمیاں
تنہا کھڑے ہیں
جانے کب اپنا بلاوا ہو
کہ ہم میں آج بھی
اِک عمر کی وارفتگی اور وحشتوں کا رقص جاری ہے
وہ بازی جو بساطِ جاں پہ کھیلی تھی
ابھی ہم نے
نہ جیتی ہے نہ ہاری ہے
اسے کہنا کبھی ملنے چلا آئے
کہ اب کی بار شاید
اپنی باری ہے

شکیب جلالی

گریز پا

دھیرے دھیرے گر رہی تھی نخلِ شب سے چاندنی کی پتیاں
بہتے بہتے اَبر کا ٹکڑا کہیں سے آ گیا تھا درمیاں
ملتے ملتے رہ گئی تھیں مخملیں سبزہ پہ دو پر چھائیاں
جس طرح سپنے کے جھولے سے کوئی اندھے کنوئیں میں جاگرے
ناگہاں کجلا گئے تھے شرمگیں آنکھوں کے نورانی دیے
جس طرح شورِ جرس سے کوئی دامندہ مسافر چونک اُٹھے
یک بیک گھبرا کے وہ نکلی تھی میرے بازوؤں کی قید سے
لب سلگتے رہ گئے تھے چھن گیا تھا جام بھی
اور میری بے بسی پر ہنس پڑی تھی چاندنی

آج تک احساس کی چلمن سے اُلجھا ہے یہ مبہم سا سوال
اس نے آخر کیوں بنا تھا بہکی نظروں سے حسیں چاہت کا جال؟

شکیب جلالی

یاد

رات اِک لڑ کھڑاتے جھونکے سے
ناگہاں سنگِ سرخ کی سِل پر
آئینہ گر کے پاش پاش ہوا
اور ننھی نکیلی کرچوں کی
ایک بوچھاڑ دل کو چیر گئی

شوکت ہاشمی

پھر خدا کے شہر میں

پھر خدا کے شہر میں
گلی گلی
سٹیٹ فورس کے

خبیث بھیڑیئے کی پیٹھ پر سوار
جبر کا سیاہ بھوت
آدمی کی نسل کے شکار کو
نکل پڑا ہے

زندگی کا خوشنما یسوع
آسمان سے بلند تر صلیب پر
کھڑا ہے
سوچتا ہے
اب کی بار موت کو
کچھ اس طرح
وہ آخری شکست دے
کہ پھر خدا کے شہر میں
سیاہ بھوت کی نمود ختم ہو
سیاہ بھوت کا وجود ختم ہو

شاہین بدر

خوش فہمی کے خوب قرینے

خوش فہمی ہے زہرِ ہلاہل
جب یہ زہر لہو میں شامل ہو جاتا ہے
انسانی سوچیں رنگوں میں بٹ جاتی ہیں
دیکھنے والی ظاہری آنکھیں
نادانی میں
کر کے اپنے آپ کو بے رنگ
چن لیتی ہیں
بھڑکیلا رنگ
باقی سارے رنگوں کو ٹھکرا دیتی ہیں
اپنی ناسمجھی کی بوسیدہ چادر میں
باندھتی ہیں یخ بستہ موسم
خوش فہمی کے خوب قرینے

ڈاکٹر طارق عزیز

خزاں کا سچ

اب جو تم لوٹ کے آؤ بھی تو کیا رکھا ہے
دل کے سب شہر جلے، آنکھ کے دریا سوکھے
کوئی جل تھل نہ رہا خون کی شریانوں میں

ایک ہی سال میں یہ جسم کی دیوار گری
پھول شاخوں پہ کھڑے تھے
کہ اچانک ٹوٹے' اور ہم سوچا کیے
تم نہیں آؤ گے
اب جو آنا ہے تو یہ بات سمجھ لو پہلے
تھوک کے خون سے نفرت و نہیں کھاؤ گے
زرد چہرے سے کہیں ڈر تو نہیں جاؤ گے
ٹوٹ کر پیار کرو گے
کہ پلٹ جاؤ گے.......پلٹ جاؤ گے

ظفر خان نیازی

سورج مکھی

وہ میری شاعری پر فریفتہ تھی
یہ میرے لیے لکھا ہے ناں
یہ کہتی اور میرا ہاتھ چوم لیتی

اور پھر ایک دن
کسی مشاعرے میں

اسے مجھ سے اچھا شاعر

مل گیا

عبید اللہ علیم

چاند چہرہ ستارہ آنکھیں

مرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں
یہ میرا چہرہ، یہ میری آنکھیں
بجھے ہوئے سے چراغ جیسے
جو پھر سے جلنے کے منتظر ہوں
وہ چاند چہرہ، ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
جنہوں نے پیماں کیے تھے مجھ سے
رفاقتوں کے، محبتوں کے
کہا تھا مجھ سے کہ اے مسافر رہِ وفا کے
جہاں بھی جائے گا ہم بھی آئیں گے ساتھ تیرے
بنیں گے راتوں میں چاندنی ہم تو دن میں سائے بکھیر دیں گے

وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
وہ اپنے پیماں رفاقتوں کے محبتوں کے
شکست کر کے
نہ جانے اب کس کی رہ گزر کا منارۂ روشنی ہوئے ہیں
مگر مسافر کو کیا خبر ہے
وہ چاند چہرہ تو بجھ گیا ہے
ستارہ آنکھیں تو سو گئی ہیں
وہ روشنی اور وہ سائے بھی تو مری عطا تھے
سو میری راہوں میں آج بھی ہیں
کہ میں مسافر رہِ وفا کا
وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں
وہ مہرباں سایہ دار زُلفیں
ہزاروں چہروں' ہزاروں آنکھوں
ہزاروں زُلفوں کا ایک سیلابِ تند لے کر
مرے تعاقب میں آ رہے ہیں
ہر ایک چہرہ ہے چاند چہرہ
ہیں ساری آنکھیں ستارہ آنکھیں
تمام ہیں'
مہربان اور سایہ دار زُلفیں
میں کس کو چاہوں' میں کس کو چوموں
میں کس کے سائے میں بیٹھ جاؤں
بچوں کہ طوفاں میں ڈوب جاؤں
کہ میرا چہرہ' نہ میری آنکھیں
میرے خدایا! میں زندگی کے عذاب لکھوں کہ خواب لکھوں

عطاء الحق قاسمی

ایک لانگ ڈسٹینس کال

تمہارا خط مجھ کو مل گیا ہے
ابھی پڑھا ہے
مجھے تو بس اتنا پوچھنا ہے
اُداس کیوں ہو؟ اُداس کیوں ہو؟
میں پوچھتی ہوں اُداس کیوں ہو؟
تمہاری آواز اتنی مدھم ہے
ایسے لگتا ہے
جیسے اپنے ہی کان میں
کوئی بات کہہ کر سمجھ رہے ہو
کہ بات مجھ تک پہنچ گئی ہے
تمہاری آواز
راستوں کی مسافتوں میں بھٹک رہی ہے

فیض احمد فیض

رقیب سے!

کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی تھی
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی' وہ رخسار' وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لُٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیرِ دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھنا
سرد آہوں کے، رُخ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے مین رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

فیض احمد فیض

یاد

دشت تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے تیرے ہونٹوں کے سراب
دشتِ تنہائی میں دوری کے خس و خاشاک تلے
کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتے ہوئے مدھم ، مدھم
دور اُفق پار چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
کھل رہی ہے تیری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے یہ اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رُخسار پہ اس وقت تری یاد میں ہاتھ
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آ بھی گئی وصل کی رات

فیض احمد فیض

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کم خواب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

فیض احمد فیض

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
ہوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فاخرہ بتول

گڑیا آج بھی اندھی ہے

کھیلتے کھیلتے دونوں میں سے
ایک نے دوجے کی گڑیا کو نوچ لیں آنکھیں
لڑکی چیخی،
دیکھو، تم نے میری گڑیا اندھی کر دی
اب سپنے کیسے دیکھے گی؟
لڑکا نادم ہو کر بولا
میں جب ابو جتنا ہو کر، شہر گیا تو
یہ وعدہ کرتا ہوں تم سے،
سب سے پہلے،
اس کی آنکھیں لاؤں گا
سنا ہے شہر گیا وہ اِک دن
جانے اس کے بعد ہوا کیا،

معلوم نہیں ہے لیکن
آج اچانک اُس لڑکی کو راہ میں دیکھا
ہاتھ میں اس کے اِک گڑیا تھی
ہاں بتلانا بھول گئی میں،
گڑیا آج بھی اندھی ہے

فاخرہ بتول

فیصلہ

چاول چنتے چنتے اس نے' یکدم سوچا
برکھا سر پر آ پہنچی ہے
اِس موسم میں
بالی عمر کے کچے خواب ستانے لگتے ہیں
بھولے بسرے لوگ دھیان میں آنے لگتے ہیں
باہر کا یہ جل تھل موسم'
اندر آگ لگا دیتا ہے
سوچوں کو جھلسا دیتا ہے
بیتی رُت کے بوجھل بوجھل'
وہ سارے پل
اِک اِک کر کے اس کی پلکوں پر آ ٹھہرے
بھیگا کاجل.......
کچھ پل سوچا اُس نے اور پھر
اُس کے ہونٹوں اور پلکوں کی لرزش بھانپی
اور اِک فیصلہ کر ہی ڈالا
آج میں اِس کے بابا سے یہ بات کہوں گی
برکھا رت آنے سے پہلے'
آؤ اِس کو رخصت کر دیں

فاخرہ بتول

وجدان

کہا نہیں تھا.......؟
کہا نہیں تھا، بچھڑ کے جینا محال ہوگا
یہ زندگی تم پہ بار ہوگی
خزاں میں لپٹی بہار ہوگی
تم ہفت افلاک میں تلاشو گے میرا چہرہ
مری وَفائیں سزا لگیں گی
فضائیں ہر پل خفا لگیں گی
کہا نہیں تھا......؟
زمانہ دھڑکن کی تال سُر کا
اَزل سے بیری ہے یاد رکھنا
وَصال لمحوں کے سلسلوں سے
لہو کا بڑھ کر خراج مانگے
فراق کا بس یہ راج مانگے
یہ دو دِلوں کو کبھی جو اِک ساتھ دیکھتا ہے
ہوا یہ سازش کا جال رکھ کر پکارتا ہے
سنو پرندو! محبتوں کا ملن کبھی بھی نہ ہو سکے گا
اور اِس زمیں میں کوئی بھی چاہت کا بیج ہرگز نہ بو سکے گا
کہا نہیں تھا؟
مگر جو مَیں نے کہا تھا تم نے سنا ہی کب تھا؟
سنا جو مَیں نے وہ تم نے جاناں! کہا ہی کب تھا؟

فاخرہ بتول

مرے اجنبی!

وہ تھکا تھکا سا تھا اجنبی
سرِ راہ مجھ کو ملا تھا جو
جسے سانس لینا محال تھا
وہ جو جی رہا تھا تو یہ بھی اُس کا کمال تھا
اُسے دل کے روگ نے کر بلا سا بنا دیا
اسے خاک میں ہی ملا دیا
وہ تھکا تھکا سا تھا اجنبی
سرِ راہ مجھ کو ملا تھا جو، وہ بچھڑ گیا
مجھے اب تلک ہے یقین کیوں
مرے اجنبی!
تو یہیں کہیں، میرے آس پاس ہے چار سُو
تری خوشبوئیں ہیں نفس نفس پہ لکھی ہوئی
تری چاہ دل کی زمین پر ہے کھدی ہوئی
میرے نرم ہاتھوں کی پشت پر ہیں ابھی تلک
ترے گرم ہونٹوں کی دستکیں
تری چاہتیں، میری روح پر ترا قرض ہے
مجھے کیوں یقین ہے اب تلک
جو تھکا تھکا سا تھا اجنبی

سرِ راہ مجھ کو ملا تھا جو، جو بچھڑ گیا
کوئی اور تھا
وہ نہیں تھا تو، کوئی اور تھا، کوئی اور تھا
تو تو اب تلک میرے ساتھ ہے
مرے ہاتھ میں تو ابھی تلک ترا ہاتھ ہے

فاخرہ بتول

نروان

بابا دینو مٹی کے کھگو گھوڑے بنا کر گلی گلی بیچا کرتا تھا
وہ آواز لگاتا ایک ایک روپے میں رنگ برنگے کھگو گھوڑے
بچے اس کی آواز پر یوں لپکتے
جیسے بھوکا روٹی کی خوشبو پر
ریز گاری کی چھوٹی سی جیب کو وہ سینے سے لگا کے رکھتا
شام کو اپنے جھونپڑے میں منتظر معصوم یتیم پوتے پوتیوں کا
پیٹ بھی تو بھرنا تھا
آخر بوڑھی ہڈیاں کہاں تک ساتھ دیتیں
دسمبر کی ایک سرد صبح، اس کی لاش سڑک کے کنارے
اکڑی ہوئی پائی گئی

کسی تیز رفتار گاڑی کے پہیوں نے شاید اس کو
نروان کا تحفہ بخش دیا تھا

قائم نقوی

چھدرے چھدرے خیال

سبز سبز موسم کی
زرد زرد آنکھوں میں
بارشوں کے ڈورے میں
لوگ کتنے کورے ہیں
سرد سرد راتوں کے
سرخ سرخ ہونٹوں پر
گرد گرد باتیں ہیں
دوستی کی گھاتیں ہیں
مصلحت سے پیڑوں کے
سائے کتنے گہرے ہیں
ہم کہاں پہ آ ٹھہرے
آج تک نہیں سمجھے

کرن رُباب نقوی

عورت

9 بجتے ہیں' سوچتی ہے
آج اُس سے بالکل بات نہیں کرنی
11 بجتے ہیں' سوچتی ہے
ناراضگی کا اظہار بھی کرنا ہے
2 بجتے ہیں' سوچتی ہے
خدا خیر کرے
5 بجتے ہیں' سوچتی ہے
فون کر کے صرف آواز سن لوں
8 بجتے ہیں' فون چلاتا ہے
لپک کر فون اُٹھاتی ہے
''کہاں تھے صبح سے.......؟''

کرن رُباب نقوی

سنو! کچھ دیر تو ٹھہرو

سنو! کچھ دیر تو ٹھہرو
میری سانسوں کو اپنی سب دُعاؤں کی
دھنک خوشبو
ذرا محسوس کرنے دو
مری آنکھوں کو اپنا روپ
پڑھنے دو
مرے ہونٹوں کو اپنا نام جپنے دو
مرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر
سہارا دو،
مری آنکھوں کو جینے کا اشارہ دو
مری سانسوں کی کشتی کو کنارہ دو
مری خواہش ہے یہ، جب بھی
میں اِس دنیا سے جاؤں تو
تمہارے ساتھ رہنے کا حسیں احساس
میرے ساتھ ہی جائے
سنو! کچھ دیر باقی ہے،
فقط کچھ دیر کو ٹھہرو.......

کرن رُباب نقوی

Departure

راستے جدا ہوتے دیر تو نہیں لگتی
پھر بھی سوچتی ہوں
دل جدا ہونا آسان تو نہیں
تم کہتے ہو
جو بھی چاہوں، اس گھر سے لے جا سکتی ہوں
سوچ رہی ہوں، کیا لے جاؤں
بک ریکس میں سلیقے سے رکھی ہوئی کتابیں،
مرے ذوق کا منہ بولتا ثبوت،
شیلفوں پہ سجے ہوئے ڈیکوریشن پیسز،
مرے شوق کے آئینہ دار،
کچن میں سے جھانکتے ہوئے نازک برتن،
جن کو میرے لمس کی عادت پڑ چکی ہے،
لان میں کھلے پھول،
گھر میں رقص کرتے حسین لمحوں کی پرچھائیاں،
مرا زادِ راہ،
اور زندگی کی ہر دراز میں جھانکتی
تمہاری محبت
میرے لیے شجرِ ممنوعہ......

کرن رُباب نقوی

خواب

شام ڈھلے سے بھور بھئے تک
سہنوں کی دہلیز پہ بیٹھے
کومل ہاتھوں کے ہالے میں
روشن چاند سا چہرہ تھامے
اُس کی باتیں سنتے رہنا
تپتے لَمس کی رو میں بہنا
ہونٹوں سے پر کچھ نہ کہنا
اس کا چہرہ تکتے رہنا
کتنا اچھا لگتا ہے نا؟
کتنا اچھا لگتا ہے نا؟
اس کا چہرہ تکتے رہنا
ہونٹوں سے پر کچھ نہ کہنا
تپتے لَمس کی رو میں بہنا
اُس کی باتیں سنتے رہنا
روشن چاند سا چہرہ تھامے
کومل ہاتھوں کے ہالے میں
سہنوں کی دہلیز پہ بیٹھے
شام ڈھلے سے بھور بھئے تک

کرن رُباب نقوی

تو کیا اب بھی.......؟

مری کی وادیوں میں برف پڑتی تھی
تو پلکوں کے کناروں پر
دھنک رنگوں کے دیپک آپ ہی آ کر
ٹھہر جاتے
انگیٹھی پر نظر پڑتی تو جم جاتی
مری آنکھوں میں شعلوں کے بدن
رقصاں نظر آتے
ہنسی چہرے پہ تھم جاتی
تم اپنی سرمئی پلکوں کی پوروں سے
مرے ہونٹوں کو چھو لیتے
مری دھڑکن بکھر جاتی
صبیح رنگت نکھر جاتی
اُفق پر چاند گھرے بادلوں سے یوں نکل آتا
کہ جیسے دیکھنا ہم کو
ضروری کام ہے کوئی
مجھے حدِّ نظر پھیلی ہوئی خاموشیاں٬
سرگوشیاں لگتیں٬
فضا میں خشک پتوں کی صدائیں

گونج بن جاتیں،
تمہیں میرا، یونہی پہروں کھڑے رہنا،
ہواؤں سے گلے ملنا
بہت معیوف لگتا تھا
(ہواؤں سے تمہاری دشمنی شاید
وہاں سے ہی بڑھی ہوگی)
وہاں ہم نے بہت چھوٹے سے گھر میں بھی
ہزاروں خواہشوں کو خود
جنم لیتے ہوئے دیکھا
ہزاروں حسرتیں معصوم بچوں کی طرح
جب صحن میں قلقاریاں بھرتیں
تو دل آباد ہو جاتے
دسمبر میں سنا ہے آج بھی یوں ہی
تو موسم پھر یہی کروٹ بدلتا ہے
سنو! اتنا تو لکھ بھیجو
تو کیا اب بھی..........؟

میرا جی

چغلی

تمہارے خط نے مرے دل پہ کچھ اثر نہ کیا
اگر چہ اس کا ہر اِک لفظ زور والا تھا
یہ کہتی ہو کہ نہیں' اب سے دل میں چاہ مری
مگر میں سوچتا ہوں خط یہ اتنا لمبا ہے؟
ہیں پورے بارہ ورق صاف اور دونوں طرف
میں پوچھتا ہوں کہ جب ''الوداع'' ہی کہنی ہو
تو کون ہے جو مصیبت میں اتنی پڑتا ہے

مصطفی زیدی

آخری بار ملو

آخری بار ملو ایسے کہ جلتے ہوئے دل
راکھ ہو جائیں کوئی اور تقاضا نہ کریں

چاک وعدہ نہ سلے، زخم تمنا نہ کھلے
سانس ہموار رہے، شمع کی لو تک نہ ہلے
باتیں بس اتنی کہ لمحے انہیں آ کر گن جائیں
آنکھ اُٹھائے کوئی اُمید تو آنکھیں چھن جائیں
اس ملاقات کا اس بار کوئی وہم نہیں
جس سے اِک اور ملاقات کی صورت نکلے
اب نہ ہیجان و جنوں کا نہ حکایات کا وقت
اب نہ تجدیدِ وفا کا، نہ شکایات کا وقت
لٹ گئی شہرِ حوادث میں متاعِ الفاظ
اب جو کہنا ہے تو کیسے کوئی نوحہ کہیے
آج تک تم سے رگِ جاں کے کئی رشتے تھے
کل سے جو ہوگا، اسے کون سا رشتہ کہیے
پھر نہ دہکیں گے کبھی عارض و رخسار، ملو
ماتمی ہیں دمِ رخصت در و دیوار، ملو
پھر نہ ہم ہوں گے، نہ اقرار، نہ انکار، ملو
آخری بار ملو!

مصطفیٰ زیدی

دیدنی

میری پلکوں کو مت دیکھو

ان کا اُٹھنا' ان کا جھپکنا' جسم کا نامحسوس عمل ہے
میری آنکھوں کو مت دیکھو
ان کی اوٹ میں شامِ غریباں' ان کی آڑ میں دشتِ ازل ہے
میرے چہرے کو مت دیکھو
اس میں کوئی وعدہَ فردا' اس میں کوئی آج نہ کل ہے
اب اس دریا تک مت آوَ جس کی لہریں ٹوٹ چکی ہیں
اس سینے سے لو نہ لگاوَ جس کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں
اب میرے قاتل کو چاہو
میرا قاتل مرہم مرہم' دریا دریا' ساحل ساحل
قاضئ شہر کا ماتھا چومو
جس کے قلم میں زہرِ ہلاہل' جس کے سخن میں لحنِ ہلاہل
اب اس رقص کی دُھن پر ناچو
جس کی گت پر لٹ گیا قاضی' جس کی لے پر بک گیا قاتل

مجید امجد

بُندا

کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا!

رات کو بے خبری میں جو مچل جاتا میں
تو ترے کان سے چپ چاپ نکل جاتا میں
صبح کو گرتے تری زُلفوں سے جب باسی پھول
میرے کھو جانے پہ ہوتا ترا دل کتنا ملول
تو مجھے ڈھونڈتی کس شوق سے گھبراہٹ میں
اپنے مہکے ہوئے بستر کی ہر اِک سلوٹ میں
جونہی کرتیں تری نرم انگلیاں محسوس مجھے
ملتا اس گوش کا پھر گوشہء مانوس مجھے
کان سے تو مجھے ہر گز نہ اُتارا کرتی
تو کبھی میری جدائی نہ گوارا کرتی
یوں تری قربتِ رنگیں کے نشے میں مدہوش
عمر بھر رہتا مری جاں، میں ترا حلقہ بگوش
کاش میں تیرے بُنِ گوش میں بُندا ہوتا!

مجید امجد

نگاہِ بازگشت

آج تھی میرے مقدر میں عجب ساعتِ دید
آج جب میری نگاہوں نے پکارا تجھ کو

میری ان تشنہ نگاہوں کی صدا
کوئی بھی سن نہ سکا!

صرف اِک تیرے ہی دل تک یہ صدا،
جاگتی دنیا کے کہرام سے چپ چاپ گزر کر پہنچی
صرف اک تو نے پلٹ کر مری جانب دیکھا
مجھے تو نے، تجھے میں نے دیکھا،

آج تھی میری نگاہوں کے مقدر میں عجب ساعتِ دید!
کیا خبر پھر تو پلٹ کر مری جانب کبھی دیکھے کہ نہ دیکھے، لیکن
ایک عمر، اب میں یونہی اپنی طرف دیکھتے دیکھوں گا تجھے

محسن نقوی

آج بھی شام اُداس رہی

آج بھی تپتی دھوپ کا صحرا
تیرے نرم لبوں کی شبنم
سائے سے محروم رہا
آج بھی پتھر ہجر کا،

صدیوں سے بے خواب رُتوں کی
آنکھوں کا مقسوم رہا
آج بھی اپنے وصل کا تارا
راکھ اُڑاتی شوخ شفق کی
منزل سے معدوم رہا
آج بھی شہر میں پاگل دل کو
تیری دید کی آس رہی
موت کی یہ گم صم تنہائی
آج بھی میرے پاس رہی
آج بھی شام اُداس رہ

منیر نیازی

سپنا آگے جاتا کیسے

چھوٹا سا اِک گاؤں تھا جس میں
دیے تھے کم اور بہت اندھیرا
بہت شجر تھے تھوڑے گھر تھے
جن کو تھا دوری نے گھیرا

اتنی بڑی تنہائی تھی جس میں

جاگتا رہتا تھا دل میرا

بہت قدیم فراق تھا جس میں

ایک مقرر حد سے آگے

سوچ نہ سکتا تھا دل میرا

ایسی صورت میں پھر دل کو

دھیان آتا کس خواب میں تیرا

راز جو حد سے باہر میں تھا

اپنا آپ دکھاتا کیسے

سپنے کی بھی حد تھی آخر

سپنا آگے جاتا کیسے

منیر نیازی

محبت اب نہیں ہوگی

ستارے جو دمکتے ہیں

کسی کی چشمِ حیراں میں

ملاقاتیں جو ہوتی ہیں

جمالِ ابرو باراں میں
یہ ناآباد وقتوں میں
دلِ ناشاد میں ہوگی
محبت اب نہیں ہوگی
یہ کچھ دن بعد میں ہوگی
گزر جائیں گے جب یہ دن
یہ اُن کی یاد میں ہوگی

محمد افسر ساجد

وہ ایک لمحہ

وہ ایک ساعت وہ ایک لمحہ
کسی کی قربت کا ایک لمحہ
تمام لمحوں سے خوب تر تھا
طویل تر تھا، حسین تر تھا
اس ایک لمحے کی راحتوں کا اس ایک لمحے کی چاہتوں کا
عذاب اب تک میں سہہ رہا ہوں
نہ جی رہا ہوں نہ مر رہا ہوں

مرتضیٰ برلاس

اجنبی

یہ سوچتا ہوں کہ انجان، اجنبی ہے تو
تجھے میں مرکزِ افکار شاعری نہ کروں
نہ جانے کون سی منزل پہ ہم بچھڑ جائیں
میں تجھ سے جرأتِ اظہارِ دلبری نہ کروں

یہ سوچتا ہوں کہیں تو بھی دوسروں کی طرح
کسی تعیشِ منزل کی جستجو میں نہ ہو
بنا ہے تو جو اُجالوں میں ہم سفر میرا
چمکتی راہ پہ چلنے کی آرزو میں نہ ہو

یہ سوچتا ہوں کہ پروردۂ جنوں ہوں میں
بہ مصلحت میں حوادث سے صلح جُو بھی نہیں
مرا تو کام ہے مصروفِ جستجو رہنا
مجھے تعیشِ منزل کی آرزو بھی نہیں

یہ سوچتا ہوں کہ اپنے ہیں جب وفا دشمن

تو اجنبی تو بہرحال اجنبی ٹھہرے
یہ سوچتا ہوں کہیں التفاتِ دو روزہ
مجھے تباہ کرے تیری دل لگی ٹھہرے

یہ سوچتا ہوں کہ صحرا نورد ہوں میں تو
مکینِ خیمۂ گل میرا ساتھ کیا دے گا
جو آشنا تھے وہی میرے ہم سفر نہ ہوئے
اِک اجنبی مری ہاتھوں میں میں ہاتھ کیا دے گا

محمد حمید شاھد

لکھ دو

''بہار کو جانے نہ دینا
ہو سکے تو اس کا دامن تھام لینا
اپنی محبت کا طوق اس کی گردن میں ڈال کر
اسے یوں مجبور کرنا
کہ وہ مست الست ہو کر
بے دست و پا ہو جائے

مگر اے شوخ و چنچل!
خدا را میری طرح اسے بھی معذور کر کے
آگے نہ نکل جانا
کہ آگے تو کانٹوں کی سیج کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"
ہاں یہ سب کچھ لکھ چکے تو
اسے یہ بھی لکھ دو........
"جب مسکراہٹ کی یکسانیت
سے تم اُکتا جاؤ
اور مسلسل مسکرانے سے
تمہاری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑیں
یا محسوس کرنے لگو.......کہ اب
خشک قہقہوں میں خوشی کم اور جبر زیادہ ہے
تو اس وقت ملول نہ ہونا
تم مجھے جہاں بے دست و پا چھوڑ گئے تھے
وہیں اسی جگہ پے
میں تمہیں ویسے ہی پڑا مل جاؤں گا
بالکل اسی مٹی کے باوے کی طرح
جس سے کوئی شریر بچہ دل بہلاتے بہلاتے
اوندھے منہ سڑک پر پھینک گیا ہو

محمد محمود احمد

سب مٹی کا مال

نیلم جیسی آنکھیں تیری ریشم جیسے بال
سب مٹی کا مال ہے سائیں سب مٹی کا مال

سونے کا کنٹھالہ تیرا چاندی کی پازیب
ہلکے زرد ستاروں والی گہری نیلی شال
سب مٹی کا مال

چاندی جیسے مکھ پر چمکے گرم ہوا کی دھوپ
مخمل جیسی نرم رگوں میں مستی کا بھونچال
سب مٹی کا مال

وقت ملے تو ٹوٹی اور بوسیدہ قبریں دیکھ
تجھ سے پہلے بھی گزرے ہیں لاکھ چمکتے لعل
سب مٹی کا مال

تو بھی فانی میں بھی فانی، فانی دن اور رات
روشن صبحیں، کاجل شامیں، ہفتے مہینے سال
سب مٹی کا مال

عجز میں عظمت پوشیدہ ہے اور ماہی مغرور
بازوں جیسے ناز تمہارے ہرنی جیسی چال
سب مٹی کا مال

تیرے روپے کے چکر کاٹے اِک شاعر کی سوچ
تیرے دروازے پہ ڈاکے ڈالے اِک مجذوب دھمال
سب مٹی کا مال

ن۔ م۔ راشد

میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں ابھی اُس کو شناسائے محبت نہ کروں
روح کو اُس کی اسیرِ غمِ الفت نہ کروں
اُس کو رسوا نہ کروں، وقفِ مصیبت نہ کروں

سوچتا ہوں کہ ابھی رنج سے آزاد ہے وہ
واقف درد نہیں، خوگرِ آلام نہیں
سحرِ عیش مین اس کی اثرِ شام نہیں

زندگی اس کے لیے زہر بھرا جام نہیں
سوچتا ہوں کہ محبت ہے جوانی کی خزاں
اس نے دیکھا نہیں دنیا میں بہاروں کے سوا
نکہت و نور سے لبریز نظاروں کے سوا
سبزہ زاروں کے سوا اور ستاروں کے سوا

سوچتا ہوں کہ غمِ دل نہ سناؤں اُس کو
سامنے اُس کے کبھی راز کو عریاں نہ کروں
خلشِ دل سے اُسے دست و گریباں نہ کروں
اُس کے جذبات کو میں شعلہ بداماں نہ کروں

سوچتا ہوں کہ جلا دے گی محبت اس کو
وہ محبت کی بھلا تاب کہاں لائے گی
خود تو وہ آتشِ جذبات میں جل جائے گی
اور دنیا کو اِس انجام پہ تڑپائے گی
سوچتا ہوں کہ بہت سادہ و معصوم ہے وہ
میں اُسے واقفِ اُلفت نہ کروں!

ناصر کاظمی

ساتواں رنگ

بال کالے سفید برف سے گال
چاند سا جسم، کوٹ بادل کا
لہر یا آستین، سرخ بٹن
کچھ بھلا سا تھا رنگ آنچل کا
اب کے آئے تو یہ ارادہ ہے
دونوں آنکھوں سے اُس کو دیکھوں گا

ڈاکٹر نصر اللہ خان ناصر

مسافر کب پلٹتا ہے

جُدا ہونے کا موسم آ گیا ہے

اُداسی چار سو بینر لگاتی پھر پھر رہی ہے
''الوداع'' کے
دُکھوں نے شہر کے سب راستوں پر
بچھڑ جانے کے نوحے لکھ دیے ہیں
ہزاروں خواب رخصت ہو رہے ہیں
کوئی پیان
آنسو بن کے آنکھوں میں
کسی دلدار لہجے کو ترستا ہے
خدا جانے مسافر کب پلٹتا ہے

نیاز احمد صوفی

مشورہ

مجھے کنارے کی کب تمنا
تمہیں ہے دریا کے پار جانا
مگر یہ سوچو
کہ آج دریا چڑھا ہوا ہے
بپھرتی موجوں کی سرخ آنکھیں بتا رہی ہیں

خراج مانگے گا آج دریا

ترا ضروری ہے پار جانا

تو ایسا کر لو

مجھے شریکِ سفر بنالو

کہ میرا کیا ہے

خراج مانگے جو تم سے دریا

مجھے بھنور میں اُتار جانا

ترا ضروری ہے پار جانا

وزیر آغا

ندامت

تب ترے لب پہ تبسم کی کرن لہرائی

سرمگیں پلکیں اُٹھیں لرزشِ موہوم کے ساتھ

مدھ بھری آنکھوں کی نتھری ہوئی گہرائی سے

وہ چمکتے ہوئے' ہنستے ہوئے' تارے اُبھرے

اِک نے مژگاں کے چمن زار کو سیراب کیا

دوسرا خار سے دامن کو چھڑا کر لپکا

خاک پر میری طرح گر کے رہا، گر کے رہا
لب جو میں وقت کی بے رحم سی اِک موج کے ساتھ
کسی کاغذ کے کھلونے کی طرح بہتا ہوا
دم بدم تند ہواؤں کے تھپیڑے سہتا
ایک پل کے لیے پتھر کے جزیرے پہ رُکا
تو مجھے پھیلی ہوئی رات کی تاریکی میں
اس ترے پہلے ستارے کی بہت یاد آئی
کاش میں تیری مسرت کو جواں رکھ سکتا
کاش میں تیرے تبسم کو سہارا دیتا
تاابد تیری نگاہوں میں لرزتا رہتا

وصی شاہ

کنگن

کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا
تو بڑے پیار سے چاؤ سے بڑے مان کے ساتھ
اپنی نازک سی کلائی میں چڑھاتی مجھ کو
اور بے تابی سے فرصت کے خزاں لمحوں میں

تو کسی سوچ میں ڈوبی جو گھماتی مجھ کو
میں ترے ہاتھ کی خوشبو سے مہک سا جاتا
جب کبھی موڈ میں آ کر مجھے چوما کرتی
تیرے ہونٹوں کی میں حدت سے دہک سا جاتا
رات کو جب بھی نیندوں کے سفر پر جاتی
مرمریں ہاتھ کا اِک تکیہ بنایا کرتی
میں ترے کان سے لگ کر کئی باتیں کرتا
تیری زُلفوں کو ترے گال کو چوما کرتا
جب بھی تو بندِ قبا کھولنے لگتی جاناں
اپنی آنکھوں کو ترے حسن سے خیرہ کرتا
مجھ کو بے تاب سا رکھتا تری چاہت کا نشہ
میں تری روح کے گلشن میں مہکتا رہتا
میں ترے جسم کے آنگن میں کھنکتا رہتا
کچھ نہیں تو یہی بے نام سا بندھن ہوتا
کاش میں تیرے حسیں ہاتھ کا کنگن ہوتا

وصی شاہ

تمہارے ہاتھوں کے لیے ایک دُعا

میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا

ایسا لگتا ہے جو یہ ہاتھ دُعا کو اُٹھیں
خود فرشتے چلے آتے ہوں زمیں کی جانب
سونپ کر مرمریں ہاتھوں کی ہتھیلی کو حنا
جو بھی مانگا ہو وہ چپ چاپ دیے جاتے ہو
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
ان کی خوشبو سے معطر ہے مرا سارا وجود
انہی ہاتھوں میں مرے خواب چھپے ہیں مولا
اُنگلیاں مجھ کو محبت میں بھگو دیتی ہیں
انہی پوروں نے مرے درد چُنے ہیں مولا
ان کی رَگ رَگ میں محبت ہی محبت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
انہی ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر ہے مرا
یہ جو کونے میں ستارہ ہے سکندر ہے مرا
خواب سے نرم خیالوں کی طرح نازک ہیں
ان کے ہر لمس میں میرے لیے چاہت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا
میرے مولا یہ حسیں ہاتھ سلامت رکھنا

****